لاہور کے باغات بہ عہدِ مہاراجا رنجیت سنگھ

ڈاکٹر محمد عظیم اقبال

Dr. Muhammad Azeem Iqbal

Assistant Professor, Department of Urdu,
Government M.A.O. College, Lahore.

Abstract :

Lahore is situated on the part of earth, which is named South Asia today and it has seen the Stone, Bronze and Iron Ages. The essence of the civilization and culture(s) of this area is based on an inseprable mixture of civilizations of Dravadians, Aryans, Sakas, Persians, Greeks, Kushans, Hans, Arabs, Turks, Afghans, Mughals and Europeans, who came here at different times. However, unfortunately, the most part of written history of this area is eclipsed by sectarianism, partisanship and so-called religious and racial sense of superiority. The history of Lahore is no exception to this cycle of biased historiography. The essay aims at the study of gardens, a very important reflection of the culture in Lahore with reference to the Maharaja Ranjeet Singh's period. The author has tried his best to not let popular view point, limiting ideological chains and uncritical thinking hinder reaching conclusions, based on objectivity and neutrality.

سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کی سرزمین زرخیزی اور شادابی کے حوالے سے اپنی ایک خاص پہچان رکھتی ہے۔ یہاں کے متعدد باغات اور سبزہ زار اپنے حُسنِ تعمیر، طرزِ آرائش اور دیگر منفرد خصوصیات کی بنا پر یگانۂ روزگار اور عالمی ثقافتی ورثے کا درجہ رکھتے ہیں۔ باغات نے برصغیر کے جن شہروں کی تمدنی و ثقافتی اقدار میں گراں قدر اضافے کیے، اُن میں راجہ رام چندر جی کے فرزند لوہ کا آباد کردہ شہر لاہور(۱) ایک نہایت ممتاز مقام کا حامل ہے اور اسے ''باغوں کا شہر'' قرار دیا جاتا ہے۔

لاہور کی یہ خصوصیت بلاشبہ شاہانِ مغلیہ کے ذوقِ جمال، علوم وفنون کی سرپرستی، زندہ دلی اور رچے ہوئے تمدنی شعور کی مرہونِ منت ہے۔(۲) مغلیہ عہد کا لاہور ایک لہلہاتے ہوئے چمن کی تصویر بن چکا تھا۔(۳) ایک رائے کے مطابق مغلوں سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی قریباً پانچ صدیوں پر محیط تاریخ میں ''باغات کا چنداں رواج اور شوق نہ تھا اور اگر کہیں باغات تھے بھی تو انقلابِ زمانہ نے اُن کو ملیا میٹ کر دیا۔'' (۴) تاہم باغات کے ملیا میٹ ہو جانے سے یہ خیال کرنا کہ ''باغات کا چنداں رواج اور شوق نہ تھا'' ناقابلِ فہم ہے۔ مسلم عمل داری سے قبل لاہور کی تاریخی جزئیات پردۂ اخفا میں ہیں، لہٰذا اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا خاصا مشکل ہے، تاہم محولہ بالا رائے یوں بھی قرینِ قیاس قرار نہیں دی جا سکتی کہ ہندوستان کی قدیم معلومہ تاریخ میں اشوکِ اعظم(۵) اور گوتم بدھ کے ادور میں بھی باغات کی موجودگی کی شہادتیں ملتی ہیں۔(۶)

مغلوں کی گرفت کمزور پڑنے کے بعد بالآخر رنجیت سنگھ اس شہر میں ایک طاقت ور حکومت کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔(۷) سکھوں کا عرصۂ اقتدار ۱۷۶۵ء تا ۱۸۴۹ء کو محیط ہے(۸) اور اس کا غالب عرصہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت (۱۷۹۹ء تا ۱۸۳۹ء) پر مشتمل ہے۔(۹) اس دور کا بیانیہ ہمارے ہاں بالعموم نظریاتی اور مذہبی جذباتیت کے جبر کا شکار رہا ہے(۱۰) جس کے نتیجے میں عمومی سطح پر ایک نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ ''رنجیت سنگھ کے چالیس سالہ دور میں شہر (لاہور) ایک مرتبہ پھر کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا۔''(۱۱) جب کہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ یہ رنجیت سنگھ ہی تھا جس نے نہ صرف احمد شاہ ابدالی کے ''ڈرون حملوں''(۱۲) اور سکھ مثلوں(۱۳) کی خوں ریزیوں(۱۴) سے تباہ حال لاہور کو(۱۵) بلکہ اپنے زیرِ انتظام وسیع و عریض خطۂ پنجاب (۱۶) کو ترقی و استحکام اور امن و آشتی کی شاہراہ پر گام زن کیا۔(۱۷) فی الاصل اس ''مہاراجا کا دور اہلِ پنجاب کے لئے امن اور خوش حالی کا ایک ٹھہرا ہوا لمحہ تھا جسے قدرت نے چالیس سالوں پر محیط کر دیا تھا۔''(۱۸)

اگرچہ رنجیت سنگھ کے لاہور کو ہر پہلو سے مثالی قرار نہیں دیا جا سکتا(۱۹) اور نہ ہی اس کا موازنہ عظیم الشان مغل سلطنت کے لاہور سے کرنا ممکن ہے(۲۰) تاہم اسے ''کھنڈر'' قرار دینا بھی تاریخی حقائق سے انحراف کے مترادف ہوگا۔(۲۱) سکھ عہد کے ایک نہایت سخت گیر نقاد محمد عبداللہ قریشی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ:

> ''خالصہ عہد میں تخریب کا جتنا کام ہوا تعمیر کا اتنا نہیں ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھی بہت سی اسلامی عمارات کو مٹایا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس نے اور اس کی بعض رانیوں نے کئی ایک مزارات کی مرمت بھی کروائی، مجاوروں کے روزینے مقرر کئے، مسجدیں تعمیر کرائیں اور مسلمان فقرا کی قدم بوسی کے لیے ان کی خدمت میں

حاضر ہونے کو بہت بڑی سعادت سمجھا۔''(۲۲)

ڈاکٹر علی محمد خان رقم طراز ہیں کہ :

''رنجیت سنگھ کے امراء نے کھنڈرات صاف کر کے جا بجا باغات لگوا لیے تھے اور ایک بار پھر لاہور کے نواح میں اس قدر باغات ہو گئے تھے جن کی نظیر صرف جہانگیر اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ملتی ہے۔ان باغات سے نہ صرف یہ کہ پھل حاصل ہوتا تھا بلکہ نواحِ شہر کی فضا بھی شاداب ہو گئی تھی۔''(۲۳)

ڈاکٹر ممتاز گوہر جنہوں نے رنجیت سنگھ کی شخصیت اور اس کی کارگزاریوں کا کڑا محاکمہ کیا ہے، رقمطراز ہیں کہ:

''تمدنی اعتبار سے مہاراجا کا پنجاب ایک سرسبز باغ تھا۔ دیکھنے کے لیے بھی اور دکھانے کے لئے بھی۔ مہاراجا نے قیامِ سلطنت کے بعد پنجاب کے مختلف حصوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی جس میں احساسِ فتح وغرور اور احساسِ خوش حالی دونوں موجود تھے۔ مہاراجا کی شخصیت خود رنگا رنگ خصائص کا مجموعہ تھی۔ قدرت نے ایک کریہہ المنظر انسان کے وجود میں ایک بہادر، شجاع، عالی ہمت، فاتح، عاشق، متعصب، جابر، درویش اور عیاش کی روح ڈال دی تھی۔ مہاراجا کے زمانے میں پنجاب کے تمام شہروں میں لاہور اور امرتسر کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ لاہور پنجاب کا دارالحکومت اور عروس البلاد تھا۔''(۲۴)

سیّد محمد لطیف کے بقول:

''مہاراجہ کو پھولوں کا نہایت شوق تھا اور شہر کے گرد بہت سے باغات اور چمن تھے جن میں انواع واقسام کے پھول بوٹے تھے۔ ہر ایک چمن کے ساتھ ایک مکان بھی تھا۔ مہاراجہ فرصت کے وقت ان چمنوں میں جا کر اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔''(۲۵)

محمد عبداللہ قریشی نے اس منظر کو قدرے تفصیل سے پیش کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ:

''.....(مہاراجہ کو) مناظرِ قدرت اور انواع واقسام کے باغات و چمنستان اور پھل پھلواڑیوں کا وہ شوق تھا کہ دہلی دروازے سے لے کر شالامار باغ تک جو پانچ میل کا فاصلہ تھا، دو رویہ سبزہ زار،

کھیتوں کی بہار اور باغات کی کثرت سے ہرا بھرا دکھائی دیتا تھا۔ یہ اُس رستہ کا ذکر ہے جو سلطان پورہ اور مزار گھوڑے شاہ سے ہو کر باغبان پورہ اور بھوگی وال سے دامن بچاتا ہوا شالامار باغ کو نکل جاتا ہے۔ یہی رستہ قدیم بادشاہی رستہ کہلاتا تھا۔ ان ایام میں کہیں سبزہ لہلہاتا نظر آتا، کہیں دور دور تک گل وگلزار کے تختے دکھائی دیتے۔ جب ۱۸۳۷ء میں سر ہنری فین سپہ سالارِ افواجِ ہند، مہاراجہ کی دعوت پر لاہور آیا تو مہاراجہ اس کے ساتھ شالامار سے اسی رستے قلعہ میں آیا۔ سر ہنری فین سبزہ زار کی یہ روح افزا کیفیت دیکھ کر بہت محظوظ ہوا اور مہاراجہ کی، اس جدت کی اُس نے بہت تعریف کی۔''(۲۶)

سکھوں کے عہدِ حکومت میں جو نئے باغات تعمیر ہوئے یا جن تلف شدہ باغوں کو از سرِ نو آباد اور آراستہ کیا گیا، اُن کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اس زمانے کی تعمیراتی سرگرمیوں کا ذکر مفتی تاج الدین اس طور سے کرتے ہیں:

''امرائے ریاست نے بہت باغ اور کوٹھیاں عالی شان تعمیر کرائیں اور فقرا نے بہت مقبروں اور مزاروں کی رونق کو تازہ کیا اور جا بجا مکانات سکنی بطور تکیہ آراستہ اور معمور کرائے، عوام کے مکانات کی تو کچھ گنتی نہ تھی مگر جو بڑے بڑے آدمیوں نے باغات بنوائے یا بحکم سرکار پرانے باغوں کو آراستہ کیا، وقتِ خاتمۂ ریاستِ سکھاں ایک سو ستائیس گنتی میں آئے۔ ایک باغ شالامار اس تعداد سے مستثنیٰ ہے۔ ماورا اس کے ہر ایک باغ نیا یا پرانا معمورہ یا آراستہ عہدِ مہاراجا صاحب و پسماندگانِ مہاراجا صاحب باستثنیٰ ان باغوں کے جو کہ آراستہ ہو کر پھر ویران ہو گئے، اگر ہر ایک باغ کی کیفیت اور ماہیت لکھوں تو خوفِ تطویلِ کلام ہے۔''(۲۷)

یہاں ہم صرف چند ایک باغات کے نام گنوانے پر اکتفا کرتے ہیں:(۲۸)

نمبر شمار	باغ کا نام	نمبر شمار	باغ کا نام
۱۔	بادامی باغ	۲۔	باغ مہاراجا رنجیت سنگھ
۳۔	حضوری باغ	۴۔	باغ راجہ دھیان سنگھ
۵۔	باغ دیوان کرپارام	۶۔	باغ ونتورہ

۷۔	کڑی باغ	۸۔	باغ مصر دیوان چند ظفر جنگ بہادر
۹۔	باغ سردار جوالا سنگھ	۱۰۔	باغ دیوان رتن چند داڑھی والا
۱۱۔	باغ سردار لہنا سنگھ سندھانوالہ	۱۲۔	باغ راجہ دینا ناتھ
۱۳۔	باغ راجہ کنہیا لال کمپوہ والا	۱۴۔	باغ بھائی مہاں سنگھ
۱۵۔	باغ سردار تیجا سنگھ	۱۶۔	باغ جمعدار خوشحال سنگھ گرجا کھیہ
۱۷۔	باغ سردار رتن سنگھ گرجا کھیہ	۱۸۔	باغ ہری سنگھ نلوہ
۱۹۔	باغ موراں والا	۲۰۔	باغ رانی گل بیگم
۲۱۔	باغ ہمت کہار	۲۲۔	باغ چھاؤنی جمعدار خوش حال سنگھ
۲۳۔	باغ ٹھاکر دوارہ بھوری سرکار	۲۴۔	باغ چھجو بھگت
۲۵۔	فیض باغ راجہ دینا ناتھ	۲۶۔	باغ منگلاں
۲۷۔	باغ جگت سنگھ اٹاری والا	۲۸۔	باغ راجہ سوچیت سنگھ
۲۹۔	باغ اہلووالیہ	۳۰۔	باغ بندوالا
۳۱۔	باغ شاہ بلاول	۳۲۔	باغ جوالہ سنگھ بہرانیہ
۳۳۔	باغ داؤدی	۳۴۔	باغ وستی رام
۳۵۔	باغ رام بلاول	۳۶۔	نواب کا باغ
۳۷۔	باغ جواہر مل مستری	۳۸۔	باغ کرپا رام
۳۹۔	باغ بھگت رام	۴۰۔	باغ فقیر نورالدین
۴۱۔	باغ شام داس	۴۲۔	باغ رتن چند مہر والا
۴۳۔	باغ نولکھا	۴۴۔	باغ اویتو یلہ
۴۵۔	باغ کرت صاحب	۴۶۔	باغ گہنیا چیتو والہ
۴۷۔	باغ دیوان بشن سنگھ	۴۸۔	باغ مہر نوراللہ
۴۹۔	باغ دلکشا	۵۰۔	باغ مقبرہ
۵۱۔	باغ ہاشم خاں	۵۲۔	باغ بختاور خاں
۵۳۔	باغ نواب سرفراز خاں ملتانی	۵۴۔	باغ خوجہ
۵۵۔	باغ پنڈت مدسوون	۵۶۔	باغ مہابت خاں
۵۷۔	باغ گہنیا کمپوہ والا	۵۸۔	باغ ہری سنگھ

عہدِ رنجیت سنگھ کے باغات اور دیگر تعمیرات کے مجموعی جائزے سے یہ امر عیاں ہے کہ مغلوں کے مقابلے میں سکھوں کا تعمیراتی ذوق اعلیٰ تربیت یافتہ نہ تھا۔ انہوں نے بہت سے مقابر اور تاریخی عمارات سے قیمتی پتھر اتروا کر دیگر تعمیرات میں صرف کئے۔(۲۹) سکھوں پر یہ اعتراض بھی بہ کثرت عائد کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا کوئی منفرد اور نمائندہ طرزِ تعمیر پیش نہ کر سکے(۳۰) ان کی تمام تر تعمیرات ہندو مسلم طرزِ تعمیر کا امتزاج ہیں۔(۳۱) یہ بات درست ہونے کے باوجود ذرا گہرے مطالعہ کی متقاضی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر تارا چند ہماری رہنمائی کچھ یوں کرتے ہیں:

> ''اٹھارہویں صدی عیسوی میں اس ہندو مسلم طرزِ تعمیر کا اثر پورے ہندوستان میں پھیل گیا حتیٰ کہ دور دراز علاقہ نیپال بھی اس متعدی اثر سے نہ بچ سکا۔ لی بان (Le Bon) کی تقسیم کے مطابق نیپال کے تیسرے قسم کے مندروں میں پتھر کے ایسے مندر شامل ہیں جن سے چینی (Chinese) اثر زائل ہو گیا ہے اور جن پر ہندو اثر محسوس ہونے لگا ہے۔ انھی میں چند ایسے بھی مندر ہیں جن میں گنبد کی وجہ سے مسلم اثر کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک نظیر کھٹمنڈو (Khatmandu) کا مندر ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے محلات، چھتریاں اور منادر خواہ وہ مغرب میں جام نگر (Jamnagar) کے مقام پر تعمیر ہوئے ہوں یا مشرق میں کلکتے میں یا پنجاب میں سکھوں کے تعمیر کردہ ہوں یا وسط ہند میں جینیوں (Jains) کے بنائے ہوئے ہوں، یہ سب ہندو مسلم طرزِ تعمیر کے مطابق بنائے گئے ہیں۔ بنارس میں ویشیش وَر (Viseswar) کا مندر، امرتسر میں سکھوں کا سنہرا گوردوارہ، سندھیا (Sindhia) کی ماں کا بنایا ہوا گوالیار کا مندر اور کلکتے کا پگوڈا اور اسی طرح لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے محلات، کاٹھیاوار میں رائے صاحب آف جام نگر کے محلات، چھتر پور میں راجا چھتر پور کے محلات، اور اجمیر میں سیٹھوں کے محلات بھی ہندو مسلم طرزِ تعمیر کے مظہر ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا یادگاری مقبرہ اور اُسی طرح کوٹہ میں مہاراجا امید سنگھ، الور میں مہاراجا بختاور سنگھ کے یادگاری مقبرے ہندو مسلم طرزِ تعمیر کے آئینہ دار ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ سوائے مغربی طرزِ تعمیر کی عمارتوں کے، موجودہ زمانے میں تعمیری اہمیت کی جو بھی

عمارت بنائی گئی ہے، وہ ایسی ہی ہے۔'' (۳۲)

سکھوں کے تعمیر کردہ اور نوآراستہ باغات میں سے کچھ تو تقسیمِ ہند کے کئی برس بعد تک بھی کسی نہ کسی حالت میں موجود تھے لیکن پھر شہری آبادی کے بے پناہ اور بے ترتیب پھیلاؤ، جدید تمدنی ضروریات، مذکورہ باغات کے گرداگرد بلند و بالا اور مضبوط فصیلوں کی عدم موجودگی اور ناقدریِ زمانہ نے رفتہ رفتہ ان کو صفحۂ ہستی سے مکمل طور پر مٹا ڈالا اور آج صرف ''حضوری باغ'' سکھ عہد کی چمن آرائی کی اکلوتی یادگار کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نور احمد چشتی، تحقیقات چشتی، لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۶ء، ص: ۵۸

۲۔ ممتاز تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی نے برصغیر میں مسلمانوں کے فنِ تعمیر کے پسِ پشت کارفرما سیاسی وسماجی محرکات کی نقاب کشائی کچھ یوں کی ہے:

''جب ہم ہندوستان میں، مسلمانوں کے عہد میں جو تعمیرات ہوئیں، اُن پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات واضح ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ فنِ تعمیر، جس تصور یا جس ذہن کی نمائندگی کرتا ہے وہ بادشاہ کی الوہیت اور عظمت ہے اور اس کا اظہار صرف ایک طبقے کی ثقافت ہے اور یہ حکمران طبقہ حکمرانوں، امراء اور جاگیرداروں کا تھا۔ ان عمارات میں جو انھوں نے تعمیر کرائیں، ان میں ان کا محدود طبقاتی پسِ منظر اور ذہنیت موجود ہے اور یہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ان تعمیرات کا مقصد ایک طرف تو ان کے ذاتی وسیاسی مفادات تھے اور دوسری طرف وہ ان کے ذریعے اپنی قوت وطاقت کا اظہار چاہتے تھے اور ان سے رعیت کے ذہن کو مرعوب کر کے اپنی عظمت قائم کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً اس عہد میں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں اور جنھیں فنِ تعمیر کے اصول پر پرکھتے ہیں ان عمارتوں کا تعلق صرف ایک طبقے سے تھا۔ محلات، شاہی باغات، قلعے، مقبرے، مسجدیں، فتح کی یاد میں تعمیر شدہ دروازے اور مینار وغیرہ۔ یہ عمارات جاگیردارانہ معاشرے میں ایک طبقے کی سہولت وآسودگی، حفاظت یا ان کی عظمت کے لیے تعمیر ہوئیں۔ انہوں نے صرف اس قسم کے فنِ تعمیر کی سرپرستی کی جو بادشاہ کی شخصیت اور جاگیردار طبقے کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھائے اور ان تعمیرات کے ذریعے سے ان کے کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔''

مبارک علی، ڈاکٹر، المیۂ تاریخ، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵ء، ص: ۲۰۰

۳۔ ''لاہور کے قدیم تاریخی باغوں میں شہنشاہوں اور راجاؤں کے درباروں کی محفلیں جمتی رہی ہیں۔ پائل کی جھنکار اور چوڑیوں کی چھنکار میں زندگی نغموں کے سہارے زندہ رہی ہے۔ شہزادیاں اور کنیزیں درختوں کی نرم نرم ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر پروان چڑھی ہیں۔ کلیوں اور پھولوں کی مہک سے ان باغوں کی سرسبز و شاداب روشوں پر کئی کہانیاں اُبھرتی رہی ہیں۔ یہ باغ تہذیب وتمدن کا سرمایہ ہی نہیں زندگی کے رومان اور روح پرور نغموں کے امین بھی رہے ہیں۔''

ایم۔ایس ناز، ڈاکٹر، لاہور نامہ، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۵۸

۴۔ منشی محمد الدین فوق، مآثرِ لاہور، مرتبہ: محمد عبداللہ قریشی، مشمولہ: نقوش، لاہور نمبر، لاہور، ادارۂ فروغِ اُردو، ۱۹۶۲ء، ص: ۱۴۳

۵۔ ''بنی نوع انسان کی دشوار گزار تاریخ میں اس (اشوکِ اعظم) کا اٹھائیس سالہ دورِ اقتدار بہترین زمانوں میں سے ایک تھا۔ اُس نے ہندوستان میں بے شمار کنویں کھدوائے اور چھتر کے لیے درخت لگوائے۔ اس نے علاج گاہیں، عوامی باغ اور ادویاتی جڑی بوٹیوں کی افزائش کے لئے کھیت بنوائے۔ اس نے مقامی لوگوں اور دیگر کم تر ذاتوں کی فلاح کے لیے ایک وزارت قائم کی۔ اُس نے عورتوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ اُس نے بدھ مت کے مختلف مکاتبِ فکر کے لیے بڑے پیمانے پر امدادی کارروائیاں کیں اور انھیں اپنے ہی صحائف پر بہتر اور زیادہ توانا تنقید کرنے کی تحریک دی۔''

ایچ۔جی۔ویلز، مختصر تاریخِ عالم، ترجمہ: محمد عاصم بٹ، لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۱ء، ص: ۱۳۱

۶۔ ایضاً، ص: ۱۲۸

۷۔ منیر احمد منیر، پیش لفظ: رنجیت سنگھ کا دربار، مصنفہ: ڈبلیو۔جی۔آسبرن، ترجمہ: نواب ذوالفقار علی خاں، لاہور: آتش فشاں پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص: ۶

۸۔ محمد عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر، لاہور سکھوں کے عہد میں، لاہور: کتاب خانۂ نورس، ۱۹۶۴ء، ص: ۱۱

۹۔ ایضاً، ص: ۱۷

۱۰۔ ''ملک کی تقسیم ہونے کے بعد اس بات کی توقع تھی کہ تاریخ سے تعصب اور فرقہ واریت کے جذبات ختم ہو جائیں گے۔ بدقسمتی سے ایسا دونوں ملکوں میں نہیں ہوا۔ پاکستان میں اس وقت جو تاریخ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائی جا رہی ہے اس کی بنیاد اسی تعصب اور فرقہ واریت پر ہے..... یہ ایک ایسی نسل کو پیدا کر رہی ہے جو ذہنی لحاظ سے تنگ نظری، نفرت و عناد اور تعصب و فرقہ واریت کے جذبات سے مسموم ہو کر تعلیمی اداروں سے نکل رہی ہے۔ تاریخ کے اس محدود نقطۂ نظر نے ان کے تخیل، ان کی سوچ اور فکر کو سمیٹ کر ایک تنگ خول میں بند کر دیا ہے، جس کی وجہ سے ان کی شخصیت کا پھیلاؤ بھی سمٹ کر چھوٹا ہو گیا ہے اور ان کی ذات کی تر و تازگی اور شادابی مرجھا کر ختم ہو گئی ہے۔ یہ تاریخ ایک ایسی نسل کو تیار کر رہی ہے۔ جس میں بنیاد پرستی، مذہبی جنونیت اور فاشزم کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں اور جو رواداری اور قوتِ برداشت سے قطعی عاری ہے۔ یہ المیہ صرف تاریخ ہی کا المیہ نہیں بلکہ ہمارے پورے معاشرے اور ہماری پوری تہذیب و ثقافت کا المیہ ہے۔''

مبارک علی، ڈاکٹر، المیۂ تاریخ، حیدر آباد (سندھ): آگہی پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء، ص: ۱۲، ۱۹

۱۱۔ حمیر ہاشمی و دیگر، لاہور میں دفن خزینے، لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص: ۲۷

۱۲۔ ''اس بادشاہ کی حالت عقاب کی طرح تھی۔ پہاڑی کی بلندی پر سے نشیب زمین پر تیز نظروں سے تاکتا

رہتا، جہاں شکار اس کی نظر پڑتا اپنے پہاڑی آشیانہ سے پرواز کر کے میدان میں آتا اور اپنی صید کا کام تمام کر کے اس کے استخوان، گوشت پوست جو کچھ ہاتھ لگتا، چونچ میں دبا کر پھنکڑی مار چل دیتا اور پھر ویسے ہی موقع کی تاک میں بیٹھ رہتا۔''

سیّد محمد لطیف، تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور، لاہور: گوہر پبلی کیشنز، س۔ن، ص:۱۱۵

۱۳۔ ''سکھوں کے جتھے چوں کہ مساوات کے اصول پر قائم ہوئے تھے اس لیے برابری کے خیال سے انھیں مثل کہا جاتا تھا۔ یہ مثلیں اپنے بانی کے نام، وطن یا کسی اور وصف کی بنا پر جدا جدا ناموں سے یاد کی جاتی تھیں، مثلاً بھنگی مثل، رام گڑھیہ، کنہیا، اہلووالیہ، سکر چکیہ، نکئی، ڈلی والی، نشان والیہ، کروڑ سنگھیہ، شہید یا نہنگ، فضیل پورہ اور پھلکیاں۔''

محمد عبداللہ قریشی، عہدِ حکومت خالصہ، مشمولہ: نقوش، لاہور نمبر، ص:۳۶۹

۱۴۔ سکھوں کی مسلم کشی کے تاریخی سیاق وسباق کے حوالے سے ایک بے لاگ تجزیہ ملاحظہ کیجیے۔

''پنجاب میں جو مختلف قومیں آباد تھیں، اُن میں مسلمان اکثریت میں تھے لیکن نادر شاہی اور احمد شاہی حملوں میں جہاد کے نام پر سکھوں کا جو قتلِ عام ہوا، اس کے ردِعمل نے پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں کے ظلم وستم کا شدت سے نشانہ بنایا۔ سکھ گردی سے پنجاب کی جو حالت تھی اُس کی مختلف جھلکیاں پنجاب سے متعلق معاصر اور غیر معاصر تاریخوں میں موجود ہیں۔ پھر سکھوں کی مسلمان دشمنی نادر شاہی یا احمد شاہی حملوں سے ہی متعلق نہیں بلکہ اس کا تاریخی رشتہ گرو تیغ بہادر کا اورنگ زیب کے ہاتھوں قتل اور گرو گوبند سنگھ کے دو بیٹوں کی سرہند میں ہلاکت سے ملتا ہے۔''

ممتاز گوہر، ڈاکٹر، پنجاب میں اُردو ادب کا ارتقا، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء، ص:۲۲۔۲۱

۱۵۔ مفتی تاج الدین، بلدۂ دارالسلطنت لاہور، مشمولہ: مرقعِ لاہور، تدوین، تصحیح وحواشی: ڈاکٹر انجم رحمانی، لاہور: خان بک کمپنی، ۲۰۰۹ء، ص:۳۰۸

۱۶۔ ''رنجیت سنگھ کا ۱۸۳۹ء میں انتقال ہوا تو وہ کوہِ سلیمان سے لے کر ستلج تک اور کشمیر سے لے کر ملتان سے آگے تک پنجاب کی وسیع قلمرو کا حکمران تھا۔''

لاہور گزیٹئر ۸۴۔۱۸۸۳ء، ترجمہ: نعیم اللہ ملک، لاہور: ابوذر پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص:۴۸

۱۷۔ ''رنجیت سنگھ سے قبل بھنگی مثل کی حکومت تھی۔ بھنگی مثل کے سردار چیت سنگھ، صاحب سنگھ اور مہر سنگھ لاہور کے حکمران تھے۔ وہ ظالم وجابر تھے..... لاہور کے سرکردہ شہریوں نے، جن میں زیادہ تر مسلمان تھے، شکر چکیہ مثل کے نوجوان سردار رنجیت سنگھ کے پاس ایک عریضہ بھیجا جس میں لاہور پر قبضہ کرنے کی اُس سے استدعا اور اس کام میں تعاون کی پیش کش کی گئی تھی۔''

نریندر کرشن سنہا، مہاراجہ رنجیت سنگھ، ترجمہ: کیلاش چند چودھری، کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۷۔۱۶

۱۸۔ ممتاز گوہر، ڈاکٹر، پنجاب میں اُردو ادب کا ارتقا، ص:۲۹

۱۹۔ ''سکھ عہد مجموعی طور پر عدم تحفظ اور غارت گری کا عہد تھا۔ ان آٹھ دہائیوں میں اندرونی شہر، گلیاں، بازار، کوچے اور محلے انتہائی گندے تھے، جہاں کوڑا کرکٹ کے انبار پڑے بدبو پھیلاتے رہتے۔ اگر کوئی جانور مر جاتا تو کئی کئی مہینے تک اس کا مردہ جسم پڑا گلتا سڑتا رہتا۔ گلیوں اور بازاروں میں کیچڑ اور جگہ جگہ گندہ پانی سڑاند دیتا رہتا۔ البتہ جب خوب کھل کر بارش ہوتی تو گلیوں کا یہ گند بلا صاف ہو جاتا۔ کنہیالال نے لکھا ہے ''چوں کہ بازاروں میں گھوڑے اور ہاتھی امرا کی سواریوں کے بکثرت چلتے تھے، ان کے سُم جب موریوں میں پڑتے تو اتنی چھینٹیں اُڑتی تھیں کہ لوگوں کے کپڑے رنگین ہو جاتے۔''

غافر شہزاد، سکھ عہد میں حویلیوں کی تعمیر، مشمولہ: تاریخ، پنجاب اور سکھ تاریخ نمبر، سہ ماہی، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء، ص:۱۳۹۔۱۳۸

یہاں یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ درج بالا بیان سکھ عہدِ حکومت کی مجموعی صورتِ حال کے بارے میں ہے جبکہ رنجیت سنگھ کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے تناظر میں قرینِ قیاس ہے کہ اس کے دور میں لاہور کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ نہ رہی ہوگی۔

۲۰۔(الف) ''پنجاب میں مغلیہ دورِ حکومت میں جس پہلے اہم شہر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی اور جسے سب سے زیادہ فائدہ پہنچا، وہ قدرتی طور پر لاہور ہی تھا۔ اولین مغل بادشاہوں کے دورِ حکومت کو بجا طور پر لاہور کی تاریخ کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مرتبہ پھر شاہی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ ان کو صنفِ نازک سے لگاؤ، بہادری اور مہم جوئی، روشن خیالی اور مزاح کی لطیف حس قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی تھی۔ وہ مشرق میں پروان چڑھنے والے فنونِ لطیفہ اور ادب سے بخوبی واقف تھے اور بعد میں انہوں نے حقیقی طور پر اپنے آپ کو ان کا سرپرست ثابت بھی کیا۔ ان کے دورِ حکومت میں لاہور جلد ہی علم و فضل کی آماجگاہ بن گیا۔ اب ہر جگہ بخارہ، سمرقند، ماوراالنہر اور دیگر ایشیائی ممالک سے بلائے گئے علماء، فضلاء، شعرا، مصنّفین، خطیبوں اور فلسفہ اور علم الکلام کے ماہرین کا گھر بن گئی اور یہ علاقہ علم و فضل اور امن کے فنون کی تحصیل کے لئے خوب مشہور و معروف ہو گیا۔ بہترین باغات لگائے گئے۔ آبپاشی کے ذرائع کو فروغ دینے کے لیے نہریں کھدوائی گئیں۔ وسیع مساجد بنوائی گئیں۔ سرائے اور کارواں تعمیر کروائے گئے۔ محلات اور گنبد و مینار ایستادہ کئے گئے۔ ملک کے فنِ تعمیر کو اس قدر فروغ دیا گیا جس کی کسی دور میں بھی مثال نہیں ملتی۔ آج لاہور جن اہم یادگار عمارتوں سے آراستہ ہے، ان کے بارے میں پتا چلایا گیا ہے کہ ان کا تعلق مغلوں کے ابتدائی دور سے ہے۔ اس دور میں علم و ادب کی اصناف کی ترویج ہوئی۔''

سید محمد لطیف، تاریخ لاہور، لاہور: تخلیقات، ۲۰۱۰ء، ص:۶۷

(ب) سکھ عہد سے قبل عظیم مغلوں کے دور میں ہندوستان کے شہروں کی مجموعی صورتحال کی ایک جھلک بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔ ڈاکٹر مبارک علی رقم طراز ہیں کہ

''اگرچہ مغلوں نے بڑے بڑے شہر بنائے، مگر ان شہروں میں امیر و غریب کی آبادیوں میں فرق تھا۔ ان دونوں کے محلے علیحدہ علیحدہ ہوا کرتے تھے۔ اگر ایک جانب امراء کی حویلیاں اور باغات تھے تو دوسری جانب غریبوں کی آبادیاں کچے مکانوں یا جھونپڑوں پر مشتمل ہوتی تھیں، مکان برابر ہوتے تھے، اس لیے ان کے محلوں کی آبادی گنجان ہوا کرتی تھی۔ سڑکوں اور پانی کے نکاسی کے نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے بارش میں یہاں پانی جمع ہو جاتا تھا، جس سے مختلف وبائیں پھوٹ پڑتی تھیں، بیماریوں کے علاج کے لئے کوئی سہولتیں نہیں تھیں، اس لیے اکثریت ان بیماریوں کا علاج جھاڑ پھونک سے کرواتے تھے۔

عام آدمی اپنے رہنے کے لئے کچی مٹی کے مکان بناتا تھا جس کی چھت چھپر کی ہوتی تھی۔ مکان میں عام طور سے ایک کمرہ ہوا کرتا تھا۔ کمرے میں کھڑکی یا روشن دان رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ اس میں صرف دروازے سے ہوا آتی تھی۔ فرش اور دیواروں پر گوبر کا پلاسٹر ہوا کرتا تھا۔''

مبارک علی، ڈاکٹر، عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان، مقام ندارد، ایکشن ایڈ انٹرنیشنل پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص:۱۰۱

۲۱۔ ''رنجیت سنگھ نے شہر لیا تو دوبارہ صورت آبادی کی ظہور میں آئی۔ اس نے بڑی کوشش سے حصار کے اندر کا شہر آباد کیا۔ شہر پناہ کی مرمت کی، پختہ خندق کھدوائی، دوہرے دروازے بنوائے۔ امرا و وزرا نے بھی مثل جمعدار خوشحال سنگھ و دھیان سنگھ و فقیر عزیز الدین و نور الدین و راجہ دینا ناتھ وغیرہ بے شمار امیروں نے بڑی بڑی عمارات عالیشان بلند و وسیع بنوائیں، باغ لگوائے۔ اگرچہ بادشاہی عمارات مثل مسجد بادشاہی، مقبرہ جہانگیر کے مرمت کی طرف رنجیت سنگھ نے توجہ نہ کی بلکہ ان کے پتھر اکھڑوا کر بے رونق، ویران کر دیا تھا مگر نئے مکانات، حویلیاں، باغ وغیرہ ان کے لیے بے شمار تعمیر ہوئے۔ الغرض سکھوں کی آخری سلطنت تک لاہور کی آبادی دن بدن ترقی پر تھی۔''

مفتی غلام سرور قریشی لاہوری، تاریخ مخزن پنجاب، لاہور: امن پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص:۲۲۰

۲۲۔ محمد عبداللہ قریشی، نقوش، ص:۳۷۱

۲۳۔ علی محمد خان، ڈاکٹر، لاہور کا دبستانِ شاعری، لاہور: مقبول اکیڈمی، س ن، ص:۵۵

۲۴۔ ممتاز گوہر، ڈاکٹر، پنجاب میں اُردو ادب کا ارتقا، ص:۲۸

۲۵۔ سید محمد لطیف، تاریخِ پنجاب مع حالات شہر لاہور، ص:۲۵۰۔۲۴۹

۲۶۔ محمد عبداللہ قریشی، نقوش، ص:۳۷۱

۲۷۔ مفتی تاج الدین، بلدۂ دارالسلطنت لاہور، مشمولہ: مرقعِ لاہور، ص:۳۱۰

۲۸۔ ان باغات کی مختصر تفصیل کے لیے دیکھیے ''نقوش لاہور نمبر''، ص۳۷۳ تا ۴۱۶، نیز ''مرقع لاہور''، ص:۳۱۰ تا ۳۲۵

۲۹۔ فقیر سید ایجاز الدین: ''اکبر کا دارالحکومت، سکھ تاج کا نگینہ'' مشمولہ ''لاہور، عظمتوں کی کہانی، گناہوں کی داستان''، تالیف و ترجمہ: یاسر جواد، لاہور: نگارشات، ۲۰۰۱ء، ص:۴۵

۳۰۔ غافر شہزاد، سکھ عہد میں حویلیوں کی تعمیر، مشمولہ: تاریخ پنجاب اور سکھ تاریخ نمبر، سہ ماہی، ص:۱۴۴

۳۱۔ (الف) ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کو سکھ تعمیرات میں محض مسلم طرزِ تعمیر کا رفرما دکھائی دیا۔ فرماتے ہیں:

''سکھوں نے کوئی اپنا طرزِ تعمیر پیش نہیں کیا جو اُن سے فوراً منسوب کیا جا سکے۔ اس کے ثبوت میں یہی دو متذکرہ عمارتیں سمادھ گوروارجن اور سمادھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو پیش کرتا ہوں۔ اوّل تو لاہور کے قلعہ کے شمال مغربی کونہ کے مقابل ہے اور دوسری بادشاہی مسجد کے شمال مشرقی کونہ کے باہر واقع ہے۔ محض ایک دیوار حائل ہے۔ میں اپنے ملک کے باشندوں سے پوچھتا ہوں کہ اگر ان کو پہلے یہ علم نہ ہو کہ یہ کوئی سکھ عمارتیں ہیں تو وہ فوراً ان کو اسلامی روضے شمار کریں گے کیونکہ ان کی وہی کرسی، وہی دہن ہیں۔ وہی کمانیں یا محرابیں ہیں، پھر وہی ان کے اوپر کی طرف بڑھے ہوئے درجے ہیں اور ہر منڈیر پر کوئی نہ کوئی بُرجی ہے حتیٰ کہ ہماری نظر آخیر بلب نما پہل درگنبد تک پہنچتی ہے، غرضیکہ یہ سب وہ امور ہیں جو اسلامی عمارت کے امتیازات ہیں۔ میں نے اکثر بعض غیر ملکی لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ عمارتیں اسلامی نہیں ہیں مگر انہوں نے انھیں تاریخ کی روشنی میں تو سکھ عمارتیں قبول کیا مگر طرزِ تعمیر سے ہرگز نہیں۔''

محمد عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر، لاہور سکھوں کے عہد میں، ص:۳۸۔۳۷

(ب) خود اسلامی طرزِ تعمیر کے امتیازات کیا ہیں، محمد حسن عسکری کی زبانی سنیے:

''اسلامی تعمیرات کی اصطلاح روز استعمال ہوتی ہے، مگر ایک عجیب بات ہے، ہندوستان سے لے کر اسپین تک اسلامی عمارات کو دیکھ جایئے، تعمیر کا کوئی ایک انداز نظر نہیں آئے گا۔ کہیں قبطی اثرات ہیں، کہیں رومی، کہیں یونانی، کہیں بازنطینی، کہیں ایرانی، کہیں ہندوستانی۔ خود ہندوستان ہی میں اسلامی عمارتوں کے مختلف انداز دکھائی دیں گے۔ شمال کی مغل عمارتوں میں ایرانی اثرات زیادہ ہیں تو کاٹھیاواڑ کی عمارتوں میں ہندو عناصر کا پلّہ بھاری ہے۔ جس طرح ہم ایک خاص قسم کے ستونوں اور خاص قسم کے دروازوں کی عمارت کو یونانی یا رومی کہتے ہیں ان معنوں میں اسلامی تعمیرات کا وجود ہی نہیں، اسلامی تعمیرات چند خاص اوضاع یا اشکال کا نام نہیں، بلکہ اس تصور یا اس روح کا نام ہے جو ان شکلوں کے پیچھے کارفرما ہے.....اسلامی تعمیرات کی.....اس روح نے ذرا بھی تعصب سے کام نہیں لیا اور جس قوم کے فنِ تعمیر میں جو عنصر پسند آیا بے کھٹکے لے لیا.....کوئی ایسا بڑا کلچر نہ رہا جس کے فنِ تعمیر سے مسلمانوں نے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ بازنطینی عمارتوں سے مینار لی تو ہندوستان سے گنبد لیا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی مخصوص علامت کنول کو مسجد کے اوپر جگہ دی۔''

عسکری، محمد حسن، مجموعہ محمد حسن عسکری، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص:۱۷۵۔۱۷۴

۳۲۔ تاراچند، ڈاکٹر، تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات (Influence of Islam on Indian (Culture)، مترجم: محمد مسعود احمد، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۱۰ء، ص:۳۶۵۔۳۶۴

☆.....☆.....☆